

مسئلہ تعددِ ازواج

آج کل ایک گروہ یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے کہ تعددِ ازواج کے متعلق اسلامی قانون کا جو تصور آغازِ اسلام سے آج تک بالاتفاق مسلم جلا آ رہا ہے، وہ قرآن کے خلاف ہے اور وہ نئے تصورات، جو اب اس گروہ کی طرف سے پیش کیے جا رہے ہیں، عین مطابق قرآن ہیں۔ اس بحث کو خالص علمی طریقہ سے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس مسئلے کے متعلق قرآن کے اصل ارشادات کو غور و نگاہ سے دیکھیں، اور پھر ان تاویلات کا جائزہ لیں جو آیاتِ قرآنی کو نئے معنی پہنانے کے لیے ان حضرات کی طرف سے پیش کی جاتی ہیں۔

اصل قانونِ قرآن مجید کی وہ اصل آیت، جو اسلام کے قانونِ تعددِ ازواج کی بنیاد ہے، سورہ نسا کے آغاز میں ہم کو حسبِ ذیل الفاظ میں ملتی ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلْاَقْسَاطُوْا فِی الْبَیْتِیْ فَاَنْکَحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰی
وَتَلَثًا وَّرَبْعًا ۚ فَاِذَا نَحَدَّثْتُمْ اَلَا تَعْدُوْا فَاَوْحِدًا مِّنْهُنَّ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ
ذٰلِکَ اَدْنٰی اَلَّا تَعْدُوْا۔

”اگر تم کو انا بیشہ ہو کہ تمہیوں کے ساتھ انسا ف نہ کر سکو گے تو عورتوں میں سے جو تم کو پسند آئیں ان سے نکاح کرو، دو دو، تین تین، چار چار۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو، یا ان عورتوں کو جو حیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں یہ انسانی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرنِ صواب ہے۔“

اس آیت کے تین مفہوم اہل تفسیر نے بیان کیے ہیں:

۱۔ حضرت عائشہؓ اس کی تفسیر میں فرماتی ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جو یتیم بچیاں لوگوں کی سرپرستی میں ہوتی تھیں ان کے مال اور ان کے حسن و جمال کی وجہ سے، یا اس خیال سے کہ ان کا کوئی سردھرا تو ہے

نہیں، جس طرح ہم چاہیں گے دبا کر رکھیں گے۔ وہ ان کے ساتھ خود نکاح کر لیتے تھے اور پھر ان پر ظلم کیا کرتے تھے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو دوسری عورتیں دنیا میں موجود ہیں، ان میں سے جو تمہیں پسند آئیں ان کے ساتھ نکاح کر لو۔ اسی سورۃ میں انہیں رکوع کی پہلی آیت، اس تفسیر کی تائید کرتی ہے۔

(۲) ابن عباسؓ اور ان کے شاگرد و علمبردار اس کی تفسیر یہ بیان کرتے ہیں کہ جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک ایک شخص دس دس بیویاں کر لیتا تھا اور جب اس کثرت ازواج سے مصداقِ برہنہ بنتے تھے تو مجبور ہو کر اپنے یتیم بھتیجیوں، بھانجیوں اور دوسرے بے بس عزیزوں کے حقوق پر دست درازی کرتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نکاح کے لیے چار کی حد مقرر کر دی اور فرمایا کہ ظلم و بے انصافی سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ ایک سے لے کر چار تک اتنی بیویاں کرو جن کے ساتھ تم عدل پر قائم رہ سکو۔

(۳) سعید بن جبیر اور قتادہ اور بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ جہاں تک یتیموں کا معاملہ ہے اہل جاہلیت بھی ان کے ساتھ بے انصافی کرنے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن عورتوں کے معاملہ میں ان کے ذہن عدل و انصاف کے تصور سے خالی تھے۔ چاہتے تھے شادیاں کر لیتے تھے اور پھر ان سے کہہ ساتھ ظلم و جور سے پیش آتے تھے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو عورتوں کے ساتھ بھی بے انصافی کرنے سے ڈرو۔ اول تو چار سے زیادہ نکاح ہی نہ کرو، اور اس چار کی حد میں بھی بس اتنی بیویاں رکھو جن کے ساتھ انصاف کر سکو۔

آیت کے الفاظ ان یتیموں تفسیر و ایک کے متعل ہیں۔ اور عجب نہیں کہ تینوں مفہوم مراد ہوں۔ نیز اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ ویسے انصاف نہیں کر سکتے تو ان عورتوں سے نکاح کر لو جن کے ساتھ یتیم بچے ہیں، تاکہ وہ یتیم تمہارے اپنے بچوں کی طرح ہو جائیں اور تم ان کے مفاد کا لحاظ کرنے لگو۔

اس بات پر توجہ! فقہان سے امت کا اجماع ہے کہ یہ آیت ایک مسلمان مرد کو یہ اختیار دیتی ہے

کہ چار کی حد تک وہ خفی بیویاں چاہتے کرے، اور یہ فیصلہ اس کی اپنی ہی صوابدید پر چھوڑتی ہے کہ وہ ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے یا ایک سے زیادہ کو اپنی زوجیت میں لائے

اس بات پر بھی فقہائے امت کا قریب قریب اجماع ہے کہ اس آیت کی رو سے تعدد ازواج کو محدود کیا گیا ہے اور بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کو ممنوع کر دیا گیا ہے۔ حیات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، چنانچہ احادیث میں آیا ہے کہ طائفہ کا یس عیلان جب اسلام آیا تو اس کی نو بیویاں تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ چار بیویاں رکھ لے اور باقی کو چھوڑ دے۔ اسی طرح ایک دوسرے شخص رسول بن معاویہ کی پانچ بیویاں تھیں۔ آپ نے حکم دیا کہ ان میں سے ایک کو چھوڑ دے۔

نیز یہ آیت تعدد ازواج کو عدل کے ساتھ مشروط کرتی ہے۔ جو شخص ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کے بعد عدل کی شرط پوری نہیں کرنا وہ درحقیقت شریعت کی دی ہوئی اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسلامی حکومت کی عدالت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جس بیوی یا جن بیویوں کے ساتھ وہ انصاف نہ کر رہا ہو ان کی داد رسی کرے۔

غلط مفروضہ | اس آیت کے الفاظ پر بار بار غور کیجیے۔ اس میں کہیں کوئی اشارہ اور کنایہ تک آپ ایسا نہ پائیں گے جس سے یہ بات نکلتی ہو کہ قرآن کی نگاہ میں تعدد ازواج فی الاصل کوئی برائی ہے اور وہ اس کی حوصلہ شکنی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ہمارے نئے دور کے یہ مفسرین دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کا اصل مقصد تو تعدد ازواج کے طریقے کو مٹانا تھا، مگر چونکہ یہ بہت زیادہ رواج پا چکا تھا اس لیے اس پر صرف پابندیاں عائد کر کے چھوڑ دیا گیا تاکہ آئندہ کسی مناسب موقع پر لوگ خود اسے ممنوع قرار دے لیں۔ سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کو قرآن کا یہ منشا آخر کس ذریعہ سے معلوم ہوا ہے؟ اگر ان کی اپنی رائے یہ ہے کہ تعدد ازواج فی نفسہ ایک برائی ہے تو انہیں یہ اختیار تو ضرور حاصل ہے کہ چاہیں تو قرآن کے علی الرغم اس کی مذمت کریں اور اسے موقوف کر دینے کا مشورہ دیں لیکن یہ حق انہیں نہیں پہنچتا کہ اپنی رائے کو خواہ مخواہ قرآن کی طرف منسوب کریں قرآن تو صریح الفاظ میں اس کو

جائز قرار دیتا ہے اور اشارۃً و کنایۃً بھی اس کی مذمت میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کرتا جس سے معلوم ہو کہ فی الواقع وہ اسے ایک بُرائی سمجھتا ہے اور اس کو روکنا چاہتا ہے۔

ناویل نمبر ۱۱ اپنے اس بے بنیاد دعوے پر یہ لوگ تاویلات کی جو عمارت کھڑی کرتے ہیں اس کا ہر جز خود اس دعوے سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ وہ کہتے ہیں:

”یہ لوگوں کے منتخب نمائندوں کا کام ہے کہ وہ اس بارے میں ایک قانون بنائیں کہ آیا ایک مسلمان ایک سے زیادہ بیویاں کر سکتا ہے اور اگر کر سکتا ہے تو کن حالات میں اور کن شرائط کے ساتھ“

اب ذرا اس آیت کے الفاظ کو دیکھیے جس میں سے یہ ضابطہ نکالا جا رہا ہے۔ اس کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اس کے مخاطب افراد مسلمین ہیں۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ ”اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے معاملہ میں تم انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کر لو، دوسرے تین تین سے اور چار چار سے، لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی سہی۔۔۔“ ظاہر ہے کہ عورتوں کو پسند کرنا، ان سے نکاح کرنا اور اپنی بیویوں سے عدل کرنا یا نہ کرنا افراد کا کام ہے نہ کہ پوری قوم یا سوسائٹی کا۔ لہذا باقی تمام فقرے بھی جو بصیغہ جمع مخاطب ارشاد ہوئے ہیں ان کا خطاب بھی لازماً افراد ہی سے ماننا پڑے گا۔ اس طرح یہ پوری آیت اول سے لیکر آخر تک دراصل افراد کو ان کی انفرادی حیثیت میں مخاطب کر رہی ہے اور یہ بات انہی کی مرضی پر چھوڑ رہی ہے کہ اگر عدل کر سکیں تو چار کی حد تک جتنی عورتوں کو پسند کریں ان سے نکاح کر لیں اور اگر یہ خطرہ محسوس کریں کہ عدل نہ کر سکیں گے تو ایک ہی پر اکتفا کریں۔ سوال یہ ہے کہ جب تک قَائِلُکُمْ مَا ظَلَمْتُمْ اور فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا کے صیغہ خطاب کو فضول اور بے معنی نہ سمجھ لیا جائے اس آیت کے ڈرامہ انچے میں نمائندگان قوم آخر کس رستے سے داخل ہو جائیں گے؟ آیت کا کوئی لفظ ان کے ایسے ماہر لغات کا دروازہ کھولتا ہے؟ اور بداعت بھی اس حد تک کہ وہی اس امر کا فیصلہ بھی کریں کہ ایک مسلمان دوسری بیوی کر بھی سکتا ہے یا نہیں، حالانکہ کر سکنے کا مجاز اسے اللہ تعالیٰ نے خود باظہار

مرتج کر دیا ہے، اور پھر ”کر سکنے“ کا فیصلہ کرنے کے بعد وہی یہ بھی طے کریں کہ ”کمن“ حالات میں اور کمن شرائط کے مطابق کر سکتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیز فرد کے --- اپنے انفرادی فیصلے پر چھوڑی ہے کہ اگر وہ عدل کی طاقت اپنے اندر پاتا ہو تو ایک سے زائد کرے ورنہ ایک ہی پر اکتفا کرے۔

تاویل نمبر ۲ | دوسری بات وہ یہ کہتے ہیں کہ :-

”ایک سے زائد نکاح اگر کیے بھی جائیں تو ان کو لازماً یتیموں کے فائدے کے لیے ہونا چاہیے، کیونکہ اسی غرض کے لیے تعدد ازواج کی اجازت دی گئی ہے۔“

یہ تاویل اس بنیاد پر کی گئی ہے کہ آیت میں ”اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دوسری شادی کی اجازت صرف یتیموں کے ساتھ انصاف کرنے کی خاطر دی گئی ہے، لہذا وہ لازماً کسی ایسی عورت ہی سے ہونی چاہیے جو کسی یتیم بچے کی ماں ہو اور اس سے شادی کرنے والے کا اصل مقصد اس یتیم کے ساتھ انصاف کرنا ہو۔

لیکن اس تاویل کی یہ بنیاد ہی سرے سے غلط ہے کہ ”یتیموں کے ساتھ انصاف“ کے معاملہ کو تعدد ازواج کی اجازت کے لیے شرط سمجھ لیا گیا ہے۔ قرآن مجید کو جس شخص نے بھی سمجھ کر پڑھا ہو وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتا کہ اس کتاب پاک میں بہت سے احکام کسی خاص موقع پر دیے گئے ہیں اور حکم دیتے وقت متعدد مواقع پر اس طرح کے الفاظ آتے ہیں کہ ”اگر ایسی عورت پیش آگئی ہے تو اس کا حکم ہے“۔ ان تمام مقامات پر شرطیہ الفاظ کو اگر شرط حکم قرار دے لیا جائے تو اس سے شریعت کی صورت ہی مسخ ہو کر رہ جائے گی۔ مثال کے طور پر دیکھیے، عرب کے لوگ اپنی لونڈیوں کو ہمیشہ کمانے پر زبردستی مجبور کرتے تھے۔ اس کی ممانعت ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے :-

لَا تَكْرِهُوْا فَتِيٰتِكُمْ عَلٰى الْبِغَاۤءِ اِنَّ اَرَدْتُمْ حَسَنًا

”اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ بچی رہنا چاہتی ہوں“ (النور ۳۳)

کیا اس آیت کا مطلب لینا صحیح ہوگا کہ یہ حکم صرف لونڈیوں سے متعلق ہے، اور یہ کہ لونڈی اگر خود زنا سے نہ بچنا چاہتی ہو تو اس سے پیشہ کر لیا جاسکتا ہے؟

دوسری غلطی اس تاویل میں یہ کی گئی ہے کہ سورہ نسا کی زیر بحث آیت کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ دراصل تعدّد ازدواج کی اجازت دینے کے لیے نازل ہوئی تھی، حالانکہ یہ مفروضہ بجلتے خود بے بنیاد ہے۔ عرب میں اور قدیم زمانے کی پوری سوسائٹی میں ہزار ہا برس سے تعدّد ازدواج مطلقاً مباح تھا۔ انبیائے سابقین میں سے اکثر متعدد بیویاں رکھتے تھے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں اس آیت کے نزول سے پہلے تین بیویاں موجود تھیں اور صحابہ کرام بھی اس پر عامل تھے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو طریقہ پہلے سے رائج چلا آ رہا ہو اس کے لیے نئے سرے سے اجازت دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ قرآن کا کسی رواج سے منع نہ کرنا خود ہی اس رواج کی اجازت کا ہم معنی تھا۔ اس لیے یہ بات سرے سے غلط ہے کہ یہ آیت تعدّد ازدواج کی اجازت دینے کے لیے نازل ہوئی تھی دراصل یہ جنگِ اُحد کے بعد نازل ہوئی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ جو بہت سی عورتیں کئی کئی بچوں کے ساتھ بیوہ رہ گئی تھیں، ان کے مسئلے کو حل کرنے کا مناسب طریقہ بتایا جائے۔ اس میں مسلمانوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ اگر تمہیں شہدائے اُحد کے یتیم بچوں کے ساتھ بے انصافی کا خطرہ ہے تو تمہارے لیے ایک سے زائد بیویاں کر کے کا دروازہ پہلے ہی کھلا ہوا ہے، شہداء کی بیوہ عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں ان کے ساتھ نکاح کر لو تا کہ ان کے بچے تمہارے اپنے بچے بن جائیں اور تمہیں ان کے مفاد سے ذاتی دلچسپی پیدا ہو جائے۔ اس سے یہ نتیجہ کسی منطق کی رو سے بھی نہیں نکالا جاسکتا کہ تعدّد ازدواج صرف اُسی حالت میں جائز ہے جبکہ یتیم بچوں کی پرورش کا مسئلہ درپیش ہو۔ اس آیت نے اگر کوئی نیا قانون بنایا ہے تو وہ تعدّد ازدواج کی اجازت دینا نہیں ہے، کیونکہ اس کی اجازت تو پہلے ہی تھی اور معاشرے میں ہزاروں برس سے اس کا رواج موجود تھا، بلکہ دراصل اس میں جو نیا قانون دیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ بیویوں کی تعداد پر چار کی قید لگا دی گئی ہے جو پہلے نہ تھی۔

اس تاویل کی غلطی بالکل کھل جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کے بعد خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد نکاح کیے اور آپ کے کسی نکاح کا بھی اصل محرک یہ امر نہ تھا کہ آپ کچھ یتیم بچوں کی پرورش کے لیے کسی خاتون کو نکاح میں لانا چاہتے تھے۔ اسی طرح صحابہ کرام نے بھی حضور کے عہد

میں اور آپ کے بعد بیویوں پر بیویاں کیں جن میں کنواریاں بھی تھیں اور بے اولاد مطلقہ یا بیواؤں بھی۔ اس دور سے لے کر آج تک فقہائے اسلام میں سے کسی نے بھی اِنْ خِفْتَهُ اِلَّا تَفْسِطُوْا کا مطلب نہیں سمجھا ہے کہ تعدد ازواج کی اجازت صرف یتیم بچوں کی پرورش کے لیے ہے اور دوسری بیوی لازماً کسی یتیم بچے کی ماں ہی ہونی چاہیے۔

تاول نمبر ۳ | غیر سی بات یہ کہی جاتی ہے کہ :

”اگر ایک مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ایک سے زیادہ بیویاں نہیں کروں گا کیونکہ میں اس کی استطاعت نہیں رکھتا، تو آٹھ کر ڈر مسلمانوں کی اکثریت بھی ساری قوم کے لیے یہ قانون بنا سکتی ہے کہ قوم کی معاشی، تمدنی اور سیاسی حالت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کا کوئی فرد ایک سے زیادہ بیویاں کرے۔“

اس عجیب طرز استدلال کے متعلق ہم عرض کریں گے کہ ایک مسلمان جب یہ کہتا ہے کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں نہ کرے گا تو وہ اس آزادی کو استعمال کرتا ہے جو اس کی خانگی زندگی کے بارے میں خدا نے اسے دی ہے۔ وہ اس آزادی کو شادی نہ کرنے کے بارے میں بھی استعمال کر سکتا ہے ایک بیوی پر اکتفا کرنے میں بھی استعمال کر سکتا ہے، بیوی مر جائے تو دوسری شادی کرنے یا نہ کرنے میں بھی استعمال کر سکتا ہے، اور کسی وقت اس کی رستے بدل جائے تو ایک سے زائد بیویاں کرنے کا فیصلہ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن جب قوم تمام افراد کے بارے میں کوئی مستقل قانون بنا دے گی تو فرد اس کی وہ آزادی سلب کرے گی جو خدا نے اسے دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسی قیاس پر کیا قوم کسی وقت یہ فیصلہ کرنے کی بھی مجاز ہے کہ اس کے آدھے افراد شادی کریں اور آدھے نہ کریں؟ یا جس کی بیوی یا شوہر مر جائے وہ نکاح ثانی نہ کرے؟ ہر آزادی جو افراد کو دی گئی ہے اسے بنائے استدلال بنا کر قوم کو یہ آزادی دینا کہ وہ افراد سے ان کی آزادی سلب کرے، ایک منطقی مغالطہ تو ہو سکتا ہے، مگر ہمیں یہ نہیں معلوم کہ قانون میں یہ طرز استدلال کیسے مقبول ہوا ہے۔

تاہم تھوڑی دیر کے لیے ہم یہ مانے لیتے ہیں کہ آٹھ کر ڈر مسلمانوں کی اکثریت، مثلاً ان میں

سے چار کروڑ ایک ہزار مل کر ایسا کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آٹھ کروڑ مسلمانوں میں سے صرف چند ہزار مل کر اپنی ذاتی راستے سے اس طرح کا کوئی قانون تجویز کریں اور اکثریت کی راستے کے خلاف اسے زبردستی ملک پر مستط کر دیں تو ان کے اپنے بیان کردہ اصول کی رو سے اس کا کیا جواز ہو گا؟ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی آبادی میں سے ایک لاکھ، بلکہ پچاس ہزار کا بھی نقطہ نظر یہ نہیں ہے کہ قوم کی معاشی، تمدنی اور سیاسی حالت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ ایک مسلمان کے لیے ایک سے زائد بیویاں رکھنا تو قانوناً ممنوع ہوا البتہ اس کا گرل فرینڈز سے آزادانہ تعلق، یا طوائفوں سے ربط ضبط، یا مستقل وابستہ رکھنا از روئے قانون جائز ہے۔ خود وہ عورتیں بھی، جن کے لیے سوکن کا تصور ہی تکلیف دہ ہے، کم ہی ایسی ہونگی جن کے نزدیک ایک عورت سے ان کے شوہر کا نکاح ہو جائے تو ان کی زندگی سستی سے بدتر ہو جائے گی۔ لیکن اسی عورت سے ان کے شوہر کا ناجائز تعلق رہے تو ان کی زندگی جنت کا نمونہ بنی رہے گی۔

تاویل نمبر ۱ چوتھی چیز متحدین کی طرف سے پیش کی جاتی ہے کہ:

”سودہ ثور کی آیت نمبر ۳۳ میں طے کیا گیا ہے کہ جو لوگ شادی کر نیکی ذرائع دیکھتے ہوں ان کو شادی نہ کرنی چاہیے۔ اگر ذرائع کی کمی کے باعث ایک شخص کو ایک بیوی کرنے سے روکا جاسکتا ہے، تو انہی وجوہ یا ایسے ہی وجوہ کی بنا پر اسے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے سے کیوں نہیں روکا جاسکتا؟“

اس تاویل میں جس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

وَلَيْسَ تَعْفٍ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ كَافًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ

”اور عفت مآبی سے کام لیں وہ لوگ جو نکاح کا موقع نہیں پاتے یہاں تک کہ

اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے“

ان الفاظ میں یہ مفہوم کہاں سے نکلتا ہے کہ ایسے لوگوں کو نکاح نہ کرنا چاہیے؟ ان میں

توصیف یہ کہا گیا ہے کہ جب تک اللہ نکاح کے ذرائع فراہم نہ کر دے اس وقت تک مجبور لوگ

عفت مآب بن کر رہیں، بدکاری کر کے نفس کی تسکین نہ کرتے پھر یہ بتا ہم اگر کسی نہ کسی طرح نکاح سے ممانعت کا مفہوم ان الفاظ میں داخل کر بھی دیا جائے، پھر بھی اس کا روئے سخن فرد کی طرف ہے نہ کہ قوم یا ریاست کی طرف۔ یہ بات تو فرد کی اپنی موابد پر چھوڑی گئی ہے کہ کب وہ اپنے آپ کو شادی کر لینے کے قابل پاتا ہے اور کب نہیں پاتا۔ اور اسی کو یہ ہدایت کی گئی ہے اگر فی الواقع یہی کوئی ہدایت کی بھی گئی ہے، کہ جب تک وہ نکاح کے ذرائع نہ پاتے نکاح نہ کرے۔ اس میں قوم یا ریاست کو یہ حق کہاں دیا گیا ہے کہ وہ فرد کے اس ذاتی معاملہ میں دخل دے اور یہ قانون بنا دے کہ کوئی شخص اس وقت تک نکاح نہ کرنے پاتے جب تک وہ ایک عدالت کے سامنے اپنے آپ کو ایک بیوی اور گنتی کے چند بچوں کے بعد جن کی تعداد مقرر کر دینے کا حق بھی ان حضرات کی راتے میں یہی آیت ریاست کو عطا کرتی ہے، پرورش کے قابل ثابت نہ کر دے؟ آیت کے الفاظ اگر کچھ اہمیت رکھتے ہیں تو اس معاملہ میں ریاست کی قانون سازی کا جواز ہمیں بتایا جائے کہ اس کے کس لفظ سے نکلتا ہے؟ اور اگر نہیں نکلتا تو اس آیت کی بنیاد پر مزید پیش قدمی کر کے ایک سے زائد بیویوں اور مقرر تعداد سے زائد بچوں کے معاملہ میں ریاست کو قانون بنانے کا حق کیسے دیا جا سکتا ہے؟

تادیل نمبر ۵ | اس سے بھی زیادہ مضحکہ انگیز استدلال یہ لوگ سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۲۹ سے کرتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں:

وَكُنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعُدُّوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمْلِكُوا كَلَّ الْمِيلِ
فَتَذَرُوهُنَّ كَمَا مَعَلَقْتُهُنَّ وَإِنْ تَصْلَحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا۔

”اور تم ہرگز یہ استطاعت نہیں رکھتے کہ عدل کرو عورتوں (یعنی بیویوں) کے درمیان، خواہ تم اس کے کیسے ہی خواہشمند ہو، لہذا (ایک بیوی کی طرف) بالکل نہ جھیک پڑو کہ دوسری کو، معنی چھوڑ دو۔ اور اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ تعیناً درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔“

ان الفاظ کی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ:

واللہ تعالیٰ نے سورہ نساء کی آیت ۳ میں عدل کی شرط کے ساتھ تعدد ازواج کی اجازت دی ہے، اور پھر اسی سورہ کی آیت ۲۹ میں یہ بات خود ہی واضح کر دی ہے کہ بیویوں کے درمیان عدل کرنا انسانی ہستیوں کے بس میں نہیں ہے۔ اب یہ ریاست کا کام ہے کہ ان دونوں آیتوں میں تطبیق دینے کے لیے ایک قانون بنائے اور ایک سے زیادہ بیویاں کرنے پر پابندیاں عائد کر دے۔ وہ کہہ سکتی ہے کہ دو بیویاں کرنے کی صورت میں چونکہ سالہا سال کے تجربات سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے اور قرآن میں بھی یہ تسلیم کیا گیا ہے، کہ دونوں بیویوں کے ساتھ یکساں برتاؤ نہیں ہو سکتا، لہذا یہ طریقہ ہمیشہ کے لیے ختم کیا جاتا ہے۔

بہیں سخت حیرت ہے کہ اس آیت میں سے اتنا بڑا معنوں کس طرح اور کہاں سے نکل آیا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ تو ضرور فرمایا ہے کہ انسان دو یا زائد بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل اگر کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا، مگر کیا اس بنیاد پر اس نے تعدد ازواج کی وہ اجازت بھی واپس لی جو عدل کی شرط کے ساتھ اس نے خود ہی سورہ نساء کی آیت ۳ میں دی تھی؟ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اس فطری حقیقت کو صریح لفظوں میں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ دو یا زائد بیویوں کے شوہر سے صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایک بیوی کی طرف اس طرح مہم تن نہ مائل ہو جائے کہ دوسری بیوی یا بیویوں کو معلق چھوڑ دے۔ بالفاظ دیگر پورا پورا عدل نہ کر سکے کا حاصل قرآن کی رو سے یہ نہیں ہے کہ تعدد ازواج کی اجازت ہی سرے سے منسوخ ہو جاتے بلکہ اس کے برعکس اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ شوہر ازواجی تعلق کے لیے ایک بیوی کو مخصوص کر لینے سے پرہیز کرے اور ربط و تعلق سب بیویوں سے رکھے خواہ اس کا ولی میلان ایک ہی کی طرف ہو یہ حکم ریاست کو مداخلت کا موقع صرف اُس صورت میں دیتا ہے جبکہ ایک شوہر نے اپنی دوسری بیوی یا بیویوں کو معلق کر کے رکھ دیا ہو۔ اسی صورت میں وہ بے انصافی واقع ہوگی جس کے ساتھ

تعدد ازواج کی اجازت سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ لیکن کسی مطلق کی رُو سے بھی اس آیت کے الفاظ اور اس کی ترکیب اور مخوی سے یہ گنجائش نہیں نکالی جاسکتی کہ مطلق نہ رکھنے کی صورت میں ایک ہی شخص کے لیے تعدد ازواج کو از روئے قانون ممنوع ٹھہرایا جاسکے، کجا کہ اس میں سے آنا بڑا مضمون نکال لیا جائے کہ ریاضت تمام لوگوں کے لیے ایک سے زائد بیویاں رکھنے کو مستقل طور پر ممنوع ٹھہرا دے۔ قرآن کی جتنی آیتوں کو بھی آدمی چاہے ملا کر پڑھے، لیکن قرآن کے الفاظ میں قرآن ہی کا مفہوم پڑھنا چاہیے، کوئی دوسرا مفہوم کہیں سے لاکر قرآن میں پڑھنا اور پھر یہ کہنا کہ یہ مفہوم قرآن سے نکل رہا ہے، کسی طرح بھی درست طریق مطالعہ نہیں ہے، کجا کہ اسے درست طریق اجتہاد مان لیا جائے۔

غلط تاویلات کی اصل وجہ آگے بڑھنے سے پہلے ہم اس طرح کی تاویلات کرنے والے حضرات کو ایک سوال پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ قرآن مجید کی جن آیات پر وہ کلام فرما رہے ہیں ان کو نازل ہوئے ۱۳۸۰ سال گزر چکے ہیں۔ اس پوری مدت میں مسلم معاشرہ دنیا کے ایک بڑے حصے میں مسلسل موجود رہا ہے۔ آج کسی ایسی معاشی یا تمدنی یا سیاسی حالت کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی جو پہلے کسی دور میں بھی مسلم معاشرے کو پیش نہ آئی ہو لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ پچھلی صدی کے اواخر سے پہلے پوری دنیا سے اسلام میں کبھی یہ تخیل پیدا نہ ہوا کہ تعدد ازواج کو روکنے یا اس پر سخت پابندیاں لگانے کی ضرورت ہے؟ کیا اس کی کوئی معقول توجیہ اس کے سوا کی جاسکتی ہے کہ اب ہمارے ہاں یہ تخیل ان مغربی قوموں کے غلبہ کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جو ایک سے زائد بیوی رکھنے کو ایک فبیح و شنیع فعل، اور خارج از نکاح تعلقات کو در بشرط تراضی طرفین، حلال و یا کم از کم قابلِ درگزر ہیں جگے ہاں بیوی کی موجودگی میں دشمن رکھنا تو جرم نہیں ہے مگر اسی رشتہ سے نکاح کر لینا جرم ہے۔ اگر مدت کے ساتھ فی الواقع اس کے سوا اس تخیل کے پیدا ہونے کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی تو ہم پوچھتے ہیں کہ اس طرح خارجی اثرات سے متاثر ہو کر قرآنی آیات کی تعبیریں کرنا کیا کوئی صحیح طریق اجتہاد ہے؟ اور کیا عام مسلمانوں کے ضمیر کو ایسے اجتہاد پر مطمئن کیا جاسکتا ہے؟

نئی نئی شرطیں بعض حضرات انہی خارجی اثرات سے متاثر ہو کر تعدد و ازدواج کی اجازت کو صرف ان حالات تک محدود رکھنے پر اصرار کرتے ہیں جبکہ ایک شخص کی بیوی بانجھ ہو، یا اتنی بیمار ہو کہ ازدواجی تعلق کے لائق نہ رہے، یا اور ایسی ہی کوئی ناگزیر مجبوری درپیش ہو۔ لیکن ان کے اس خیال کی کھلی تردید خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ہو جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ حضور نے جو ایک سے زائد نکاح کیے ان کی وجہ یہ نہ تھی کہ بیوی بیمار تھی، یا بانجھ تھی، یا اولاد زرمیہ نہ تھی، یا کچھ غمیوں کی پرورش کا مسئلہ درپیش تھا۔ ان محدود شخصی ضروریات کے بغیر آپ نے تمام نکاح یا تو تبلیغی و تعلیمی ضروریات کے لیے کیے، یا اصلاح معاشرہ کے لیے، یا سیاسی و اجتماعی مقاصد کے لیے۔ سوال یہ ہے کہ جب اللہ نے خود تعدد و ازدواج کو ان چند گنی چنی مخصوص اغراض تک جن کا آج نام لیا جا رہا ہے، محدود نہیں رکھا، اور اللہ کے رسول نے ان کے سوا بہت سے دوسرے مقاصد کے لیے تعدد و نکاح کیے، تو کوئی دوسرا شخص کیا حق رکھتا ہے کہ قانون میں اپنی طرف سے چند قیود تجویز کرے اور اوپر سے دعویٰ یہ کرے کہ یہ حد بندیاں وہ شریعت کے مطابق کر رہا ہے۔ دراصل ان ساری حد بندیوں کی جڑ یہ مغربی تخیل ہی ہے کہ تعدد و ازدواج بجا تھے خود ایک بُرائی ہے۔ اسی تخیل کی بنا پر یہ نظریہ پیدا ہوا ہے کہ یہ فعلِ حرام اگر کبھی حلال ہو بھی سکتا ہے تو صرف شدید ناگزیر ضروریات کے لیے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس وراثہ شدہ تخیل پر اسلام کا جعلی ٹھپہ لگانے کی چاہ ہے کتنی ہی کوشش کی جائے۔ قرآن و سنت اور پوری امت مسلمہ کا اٹل پھر اس سے قطعاً نا آشنا ہے۔

پھر یہ لوگ ”ناگزیر ضرورت“ کی شرط پر مزید دو شرطوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کسی عدالت، یا از روئے قانون مقرر کیے ہوئے کسی سرپرست یا پنچایت کو اس بات پر مطمئن کرے کہ اسے فی الواقع دوسری بیوی کی ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنی پہلی بیوی کو اس پر راضی کرے یا اس سے نکاح ثانی کی اجازت لے۔

یہ دونوں بالکل نرا لے اور اجنبی تخیلات ہیں جنہیں اسلامی قانون میں زبردستی داخل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اسلامی قانون تعدد و ازدواج کے لیے ”ناگزیر ضرورت“ کی شرط ہی سے نا آشنا،

کجا کہ اس پر ان دو شرطوں کا اور اضافہ کیا جاتے۔ سوال یہ ہے کہ آخر ان شرطوں کا ماننا کیا ہے اور یہ کہاں سے لائی گئی ہیں؟ کیا قرآن میں کہیں ان کا ذکر ہے؟ کیا کسی حدیث میں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟ کیا اسلام کی پوری تاریخ میں کبھی تعدد و ازدواج کے لیے یہ شرطیں لگائی گئی ہیں؟ کیا کوئی شہادت اس امر کی موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیوی کے بعد جتنی شادیاں کیں ان میں سے کسی شادی سے پہلے آپ نے صحابہ کرام کو جمع کر کے انہیں اس بات پر مطمئن کیا ہو کہ مجھے مزید ایک بیوی کی ضرورت ہے؟ یا صحابہ کرام میں سے کسی کو دوسری شادی کرنے سے پہلے اس بات پر مجبور کیا گیا ہو کہ وہ حضور کے سامنے یا صحابہ کی کسی پنچایت کے سامنے اپنی ضرورت ثابت کریں؟ یہی پہلی بیوی سے اجازت۔ تو یہ عجیب بات ہے کہ ایک مسلمان مرد اپنے نکاح کے معاملہ میں اپنے باپ اور اپنی ماں سے تو اجازت لینے کا پابند نہ ہو، مگر بیوی سے اجازت لینے کا اسے پابند کیا جاتے! غالباً یہ تجویز کسی ایسے زن مرید کے ذہن کی آفریدہ ہے جس کے نزدیک شادی ہو جانے کے بعد ایک آدمی کا تعلق ماں باپ سے کٹ جاتا ہے اور صرف بیوی ہی اس کی اکیلی سرپرست رہ جاتی ہے۔

آخری سہارا ان تمام غلط تاویلات اور من گھڑت شرطوں کے بعد آخری سہارا اس واقعہ سے لیا جاتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے دوسری شادی کر لی چاہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے روک دیا۔ اس واقعہ سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ دوسری شادی کرنا فی الواقع ایک بُری بات ہے، اسی لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو اس سے روک دیا۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ دلیل لائی جاتی ہے کہ بیکاتھنس کا نکاح ثانی اس کی بیوی اور سسرال والوں کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے، اسی لیے تو حضور نے خود اپنی بیٹی پر سوکن کا آنا گوارا نہ فرمایا۔ لہذا اگر حضور کی تقلید میں تمام لوگوں کو تعدد و ازدواج سے روک دیا جائے تو آخر مضائقہ کیا ہے۔ یہ تو عین سنت رسول کی پیروی ہوگی۔

اب ذرا اصل واقعہ کو دیکھیے جسے اسلام کے پورے قانون تعدد و ازدواج پر خط نسخ پھیر دینے کے لیے بہانہ بنایا جا رہا ہے۔

تفصیل اس قصے کی یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد حبیب ابو جہل کا خاندان مسلمان ہو گیا تو حضرت علیؑ نے اس کی بیٹی سے جس کا نام کسی نے جوئیرہ، کسی نے عمراء اور کسی نے جمیدہ بیان کیا ہے، نکاح کرنا چاہا۔ لڑکی کے خاندان والوں نے کہا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی پر بیٹی نہ دیں گے جب تک آپؐ سے پوچھ نہ لیں۔ چنانچہ انہوں نے اس کا ذکر حضورؐ سے کیا۔ ایک روایت کی رو سے خود حضرت علیؑ نے بھی اشارۃً کنایہً حضورؐ سے اجازت طلب کی اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بھی اس معاملے کا چرچا سن لیا اور جا کر اپنے والد ماجد سے اس کی شکایت کی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا:

ان بنی ہشام بن المغیرۃ استاذ فونی
ان ینکحوا بنتہم علی ابن ابی طالب فلا ذن
ثم لا اذن، ثم لا ذن الا ان یرید ابن ابی طالب
ان یطلق ابنتی ویسکم ابنتہم فانہما ہی بضعۃ
منی یریبنی ما ادا بها ویو ذینی ما اذاھا۔
بنی ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے اس بات کی اجازت مانگی
ہے کہ وہ اپنی بیٹی علی ابن ابی طالب کے نکاح میں دیں میں
اس کی اجازت نہیں دیتا، نہیں دیتا، نہیں دیتا، آلا بہ کہ
ابو طالب کا بیٹا میری لڑکی کو مطلق دے کہ ان کی
لڑکی سے نکاح کرے۔ میری لڑکی میرا نکلا ہے، جو کچھ
اسے ناگوار ہو گا وہ مجھے ناگوار ہو گا۔ اور جو چیز اسے
تکلیف دے گی وہ مجھے تکلیف دے گی۔

ما فی لستہ احرم حلالا ولا احل
حراما و لکن واللہ لا تجتمع بنت رسول اللہ
و بنت عدو اللہ امیلا رو فی روایۃ، ان فاصتہ
منی وانا اتخوف ان تفتن فی دینہا۔
میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں کرتا۔ مگر خدا
کی قسم اللہ کے رسول کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی
ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔ ایک روایت میں ہے
کہ آپؐ نے فرمایا، فاطمہ مجھ سے ہے اور میں دوتا ہوں
کہ وہ کہیں اپنے دین کے معاملہ میں نکتے میں نہ پڑ
جاتے۔

اس واقعہ پر آدمی کو یہ شبہ لاحق ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی بہت سی

نسا دیاں کیں اور عام لوگوں کو بھی چار تک بیویاں بیک وقت رکھنے کی اجازت دی، مگر خود اپنی بیٹی پر ایک سوکن کا آنا بھی آپ نے گوارا نہ کیا۔ سوکن کے آنے سے جوازیت آپ کی بیٹی کو اور بیٹی کی خاطر خود آپ کو ہو سکتی تھی، وہی اذیت دوسری عورتوں اور ان کے ماں باپ کو بھی تو لاحق ہوتی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے اپنے حق میں تو اسے بزداشت نہ کیا اور دوسروں کے حق میں اسے جائز رکھا۔

بظاہر یہ ایک سخت اعتراض ہے اور معاملے کی سادہ صورت دیکھ کر آدمی بڑی الجھن میں پڑ جاتا ہے۔ لیکن تھوڑا سا غور کیا جائے تو اس کی حقیقت سمجھ میں آ جاتی ہے۔ یہ بات ناقابل انکار ہے کہ ایک عورت کا شوہر اگر دوسری بیوی لے آئے تو اس عورت کو فطرتاً یہ ناگوار ہوتا ہے اور اس کے ماں باپ، بھائی بہن اور دوسرے رشتہ داروں کو بھی اس سے اذیت ہوتی ہے شریعت نے ایک سے زائد نکاحوں کی اجازت اس مفروضے پر نہیں دی ہے کہ یہ چیز اس عورت کو اور اس کے رشتہ داروں کو ناگوار نہیں ہوتی جس پر سوکن آئے، بلکہ اس امر واقعہ کو جانتے ہوئے شریعت نے اسے اس لیے حلال کیا ہے کہ دوسری اہم تر اجتماعی اور معاشرتی مصلحتیں اس کو جائز کرنے کی متقاضی ہیں۔ شریعت یہ بھی جانتی ہے کہ سوکنیں بہر حال سہیلیاں اور شوہر شریک بنیں بن کر نہیں رہ سکتیں ان کے درمیان کچھ نہ کچھ کشمکش اور حقیقی ضرور ہوگی اور خانگی زندگی تنجیوں سے محفوظ نہ رہ سکے گی۔ لیکن یہ انفرادی قباحتیں اس عظیم تر اجتماعی قباحت سے کم تر ہیں جو یک زوجی کو بطور قانون لازم کر دینے سے پورے معاشرے میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے شریعت نے تعدد ازواج کو حلال قرار دیا ہے۔

اب دیکھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں کیا پیچیدگی واقع ہوتی ہے۔ شرعاً آپ کی بیٹی پر بھی سوکن آنا آپ کے داماد کے لیے حلال تھا۔ اسی وجہ سے حضرت علیؓ نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا، اور اسی وجہ سے حضورؐ نے بھی یہ نہیں فرمایا کہ ان کے لیے یہ فعل حرام ہے، بلکہ آپؐ نے خود تصریح فرمائی کہ میں حلال کو حرام نہیں کرتا۔ لیکن یہاں حضورؐ کی ایک ہی شخصیت میں دو مختلف حیثیتیں جمع تھیں۔ ایک حیثیت میں آپؐ انسان تھے اور فطرتاً یہ ممکن نہ تھا کہ آپؐ کی ساجزادی کے

گھر میں سوکن آنے سے جو تلخی پیدا ہو اس کا تھوڑا یا بہت اثر آپ کی طبیعت پر نہ پڑے۔ دوسری حیثیت میں آپ اللہ کے رسول تھے اور رسول کی حیثیت سے آپ کا مقام یہ تھا کہ آپ کے ساتھ اگر کسی شخص کے تعلقات خراب ہو جائیں اور کوئی شخص آپ کے لیے موجب ازیت بن جائے تو اس کے دین ایمان کی بھی خیر نہ تھی۔ اسی وجہ سے حضور نے حضرت علیؓ کو بھی اور بنی ہشام بن مغیرہ کو بھی اس کام سے روک دیا۔ کیونکہ اگرچہ شرعاً یہ حلال تھا، مگر اس کے کرنے سے یہ اندیشہ تھا کہ یہ چیز حضرت علیؓ اور ان کی دوسری بیوی اور اس کے خاندان والوں کے ایمان اور ان کی عاقبت کو خطرے میں ڈال دے گی۔

ایک اور بات جس کا حضور نے اپنے خطبے میں ذکر فرمایا وہ یہ تھی کہ بنی ہشام بن مغیرہ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن رہ چکے تھے اور فتح مکہ کے بعد تازہ تازہ مسلمان ہوئے تھے۔ خود اس لڑکے کے باپ ابو جہل کے متعلق تو سب کو معلوم ہے کہ حضور کی دشمنی میں وہ تمام کفار سے بازی لے گیا تھا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ جنگ بدر میں وہ مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کا خاندان برسوں اس کے جذبہ انتقام میں ترسپا رہا۔ اب اگرچہ یہ لوگ اسلام قبول کر چکے تھے، لیکن یہ تحقیق ہونا ابھی باقی تھا کہ یہ قبول اسلام واقعی پورے اخلاص اور قلوب کی مکمل تبدیلی کا ثمرہ ہے یا محض شکست کا نتیجہ۔ اس حالت میں اس خاندان کی لڑکی، اور وہ بھی خاص ابو جہل کی بیٹی کا اس گھر میں سوکن بن کر پہنچ جانا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی مکہ بیت تھیں، بڑے فتنوں کا سبب بن سکتا تھا۔ ان لوگوں کی تالیف قلب تو کی جاسکتی تھی اور کی بھی گئی، لیکن اسلام کے ساتھ ان کے تعلق کا حال جیت تک ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہو جاتے انہیں عین خاندان رسالت میں گھسالا نا اور خود رسول اکرم کی صاحبزادی کے بالمقابل لاکھڑا کرنا سخت نامناسب اور بڑے خطر تھا۔ اس وجہ سے بھی حضور نے اس رشتے کو ناپسند فرمایا اور علی الاعلان کہا کہ خدا کے رسول کی بیٹی اور خدا کے دشمن کی بیٹی ایک گھر میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ نیز اس بات کی طرف بھی آپ نے اشارہ فرما دیا کہ اس سے فاطمہؓ کے فتنے میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک

فرو کو اپنے بیاہ شادی کے معاملہ میں اگرچہ وہ بچائے خود حلال ہی تھی، ایسی آزادی نہیں دی جاسکتی جس سے ایک پوری ملت کے لیے فتنہ و شر کا خطرہ پیدا ہو جائے۔

بے شک یہاں یہ اعتراض اٹھ سکتا ہے کہ ابو جہل کے خاندان سے ابوسفیان کا خاندان اسلام کی عداوت میں کچھ کم نہ تھا، پھر اگر ابو جہل کے خاندان کی لڑکی کا خانوادہ رسالت میں آنا موجب فتنہ ہو سکتا تھا تو ابوسفیان کی صاحبزادی (حضرت ام حبیبہؓ) کا خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں شامل ہو جانا کیوں خطرے سے خالی تھا؟ لیکن دونوں کے حالات کا فرق نگاہ میں ہو تو یہ اعتراض آپ سے آپ ختم ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابو جہل کی لڑکی اور ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ کا سرے سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ ابو جہل کی لڑکی اور اس کے چچا اور بھائی سب کے سب فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے۔ ان کے بارے میں یہ امتحان ہونا ابھی باقی تھا کہ ان کا ایمان کس حد تک اخلاص پر مبنی ہے اور کہاں تک اس میں شکست خوردگی کا اثر ہے۔ بخلاف اس کے حضرت ام حبیبہؓ اُس بُرے سے بُرے امتحان سے گزر کر، جو اکابر صحابہ میں سے بھی کم ہی کسی کو پیش کیا تھا، اپنے کمال اخلاص اور اپنی صداقت ایمانی کا ثبوت دے چکی تھیں۔ انہوں نے دین کی خاطر وہ قربانیاں کی تھیں جن کی نظیر مشکل ہی سے کہیں اور نظر آ سکتی ہے۔ دروغور کیجیے۔ ابوسفیان کی بیٹی، ہند بنت عتبہ (مشہور ہند جگر خوار) کی لخت جگر جس کی بھوپھی وہ عورت تھی جسے قرآن میں حمالۃ المطب کا خطاب دیا گیا ہے، جس کا نانا عتبہ بن ربیعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بزرگ دشمن تھا، اس خاندان سے اور اس ماحول سے نکل کر وہ حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ سے بھی پہلے ایمان لاتی ہیں۔ اپنے شوہر کو مسلمان کرتی ہیں۔ خاندان والوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر مہاجرین حبشہ کے ساتھ ہجرت کر جاتی ہیں۔ حبش جاکر شوہر عیسائی ہو جاتا ہے اور وہ دین کی خاطر اس کو بھی چھوڑ دیتی ہیں۔ غریب الوطنی کی حالت میں تنہا ایک چھوٹی سی بچی کے ساتھ رہ جاتی ہیں مگر ان کے عزم ایمانی میں ذرہ برابر نرمیزلزل نہیں آتا۔ کئی برس جب اس حالت میں گزر جاتے ہیں اور ایک بے سہارا خاتون دیا غیر میں ہر طرح کے مصائب جھیل کر یہ ثابت کر دیتی ہے کہ دین کو جس پائے کا خلوص، جس مرتبے

کی سیرت اور جس درجے کا کردار مطلوب ہے، وہ سب یہاں موجود ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ انتخاب ان پر پڑتی ہے اور آپ حبش ہی میں ان کو نکاح کا پیغام بھیجتے ہیں۔ غزوہ خیبر کے بعد وہ حبش سے واپس آکر حرم نبوی میں داخل ہوتی ہیں۔ اس کے نحوڑی ہی مدت بعد قریش صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اب کتے پر چڑھائی کر دیں گے۔ اس موقع پر ابوسفیان صلح کی بات چیت کے لیے مدینے آتا ہے اور اس امید پر بیٹھ کے ہاں پہنچتا ہے کہ اس کے ذریعہ صلح کی شرائط طے کرنے میں سہولت ہوگی۔ برسوں کی جدائی کے بعد پہلی مرتبہ باپ سے بیٹی کو ملنے کا موقع ملتا ہے، مگر جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرش پر بیٹھنے کا ارادہ کرتا ہے تو بیٹی فوراً یہ کہہ کر فرش اٹھا لیتی ہے کہ رسول خدا کے فرش پر ایک دشمن اسلام نہیں بیٹھ سکتا۔

ایسی خاتون کا خانوادہ رسالت میں داخل ہونا تو میرے کا بار میں ٹھیک اپنی جگہ پابین تھا۔ اس سے کسی فتنے کے زونا ہونے کا کوئی بعید ترین امکان کیا، وہم بھی نہ ہو سکتا تھا۔ البتہ اس لڑکی کا اس خاندان میں آنا ضرور فتنے کے امکانات اپنے اندر رکھتا تھا جسے اور جس کے خاندان کو صرف فتح مکہ نے اسلام میں داخل کیا تھا اور اسلام میں آتے ہوئے جس کو ابھی صرف چند عینیہ ہی ہوئے تھے۔ اسی کے بارے میں یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت کے اثرات سے اس کا اور اس کے خاندان والوں کا دل پوری طرح پاک ہوا ہے یا نہیں۔

یہ ہے اس واقعہ کی اصل حقیقت۔ اس مخصوص واقعہ میں مخصوص حالات کی بنا پر جو حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا اس کو ایسی قانون سازی کے لیے آخر کس طرح دلیل بنایا جاسکتا ہے جو قرآن اور سنت اور دور صحابہ سے لیکر آج تک کے متفق علیہ قانون کو منسوخ کر کے رکھ دے۔